منظور احسن عباسی

قرض اور سود

اسلام میں ربا (یا سود) کی دو قسمیں ہیں "ربائے نسیہ" اور "ربائے فضل"۔ لیکن حقیقت دونوں کی ایک ہے یعنی تھوڑا دے کر زیادہ لینے کی شرط پر معاملہ کرنا۔ یہ زیادتی اگر قرض میں ہو تو ربائے نسیہ ہے اور دست بدست سودے میں ہو تو ربائے فضل ہے۔ ہم دوسری قسم کے سود کا ذکر یہاں نہیں کریں گے کیونکہ وہ سود جو بالعموم ہماری بحث کا موضوع ہے وہ ربائے نسیہ ہے یعنی کسی شخص کو روپیہ یا جنس اس شرط پر اُدھار دینا کہ جتنا دیا گیا ہے اس سے زیادہ ایک مقررہ مقدار یکمشت یا بتفاریق وصول کی جائیگی۔ یہی وہ سود ہے جس کو معاشرے کی ایک ایسی بُرائی تسلیم کیا گیا ہے جس کو کسی عہد اور کسی قوم میں بھی گوارا نہیں کیا گیا باوجود اس کے کہ ایک نامعلوم عہد سے سودی معاملات کا رواج مسلسل جاری ہے تاریخ تمدن انسانی کا غالباً کوئی عہد ایسا نہیں گزرا جس میں انسانی معاشرہ سودی معاملات کے تصور سے عاری رہا ہو۔ مصر کے قدیم فراعنہ مصر کے قوانین میں سود کا ذکر موجود ہے چنانچہ مصری فاضل ڈاکٹر محمد عبداللہ دراز نے ۱۹۵۱ء میں مؤتمر قانون اسلامی منعقدہ پیرس ۱۹۵۱ء میں یونانی مؤرخ تیوڈور کے حوالے سے ایک مقالہ میں بیان فرمایا کہ فراعنۂ مصر میں سے فرعون بوخوریس نے جو ۲۴ واں فرعون تھا اپنے ملکی قانون میں سود کے متعلق یہ پابندی عاید کی تھی کہ انقضائے میعاد پر سود کی تعداد زر اصل سے دگنی نہ ہونی چاہیے۔ سودی معاملات ایک ظالمانہ نہج کے ساتھ مصر ہی میں نہیں بلکہ یونان اور روم میں بھی جاری تھے یہاں تک کہ اگر مقروض ادائے قرض نہ کر سکتا تو قرض دینے والا اُسے اپنا غلام بنا لیتا تھا، بعد میں اس قانون میں اصلاح کی گئی اور سود کی رقم بارہ فیصد سے زیادہ ممنوع قرار پائی۔ اس کے بعد کچھ اور ترمیم ہوئی اور تجارتی قرضوں اور اسی طرح کے دوسرے (یعنی نفع آور) قرضوں پر بارہ فیصد تک اور شرفاء سے چار فیصدی تک سود کی حد مقرر ہو گئی، چنانچہ فاضل مصری علامہ محمد البناء نے اپنے رسالہ "لواء الاسلام"

کی اشاعت دسمبر ۱۹۶۰ء میں اس کا تفصیل سے ذکر فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ تجار اور دوسرے شرفاء کے قرضوں میں یہ قاعدہ جاری کرنے کا سبب یہ تھا کہ ان کو جو روپیہ دیا جاتا تھا اس سے نفع کی امید ہوتی تھی۔ اسی طرح سُود کا ذکر سابقہ کتب سماوی میں بھی ملتا ہے چنانچہ موجودہ توریت میں محتاجوں سے سُود۔ لینے کی ممانعت کی گئی ہے (سفر خراج آیت ۲۲ تا ۲۵) اور سفر الاویین میں کہا گیا ہے کہ اپنے محتاج بھائی سے سُود لیتے ہوئے خوفِ خدا کرو اور پھر سفر تثنیہ میں تاکید حکم ہے کہ کسی شے پر کسی قسم کا سُود اپنے بھائی سے نہ لو لیکن ساتھ کے ساتھ غیروں سے سُود لینے کا حکم بھی موجودہ توریت میں ملتا ہے۔ علّامہ رشید رضا نے اپنی تفسیر میں آیت "فبظلم من الذین ھادوا" کے تحت اس حکم کو توریت میں اضافہ قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ انبیاء نے ہرگز سُود لینے کا حکم نہیں دیا۔

دائرۃ المعارف بُستانی میں لفظ ربا کے تحت مذکور ہے کہ بنی اسرائیل نے قید سے نجات پانے کے بعد سُودی کاروبار شروع کر دیا اور انبیاء کے ارشادات کی کوئی پروا نہ کی، یہاں تک کہ تمام آبادی کا ایک فصید حصہ سُود کے بوجھ میں دبا ہوا تھا اور اس میں اپنے پرائے کا امتیاز نہ تھا۔ اسی دائرۃ المعارف میں مذکور ہے کہ ناموس موسوی میں دولت مند اسرائیلیوں کو قرض دینے کی ممانعت کی گئی اور صرف محتاجوں کو ان کی حاجت روائی کے لیے قرض کا حکم ہوا لیکن جب تجارت کو فروغ حاصل ہوا اور لین دین کی گرم بازاری ہوئی تو ان میں قرض کا لین دین پھر رائج ہوا۔ موجودہ اناجیل میں بھی سُود کا ذکر ہے چنانچہ انجیل لُوقا میں ہے کہ اگر تم قرض دے کر اس کے عوض میں کچھ لینا چاہتے ہو تو آخر تم میں کونسی خوبی باقی رہ گئی۔ تمہیں چاہیے کہ نیکی کرو قرض دو اور اس قرض سے کسی منفعت کی امید نہ رکھو" (انجیل لُوقا ۶: ۳۴ و ۳۵)۔

علّامہ عبداللہ دراز موصوف نے اپنے پیرس کے خطبہ میں یہ بات بھی بتائی ہے کہ سیّدنا مسیح علیہ السلام نے سُودی کاروبار کی مطلقاً ممانعت فرمادی تھی البتہ مسیحی علماء نے جو اس کی اجازت دی ہے وہ اباحت پسندی اور ان کی غلطی ہے۔ مسیحی اساقیف نے اس کی سخت تردید کی ہے چنانچہ پادری سکوبار کا فتویٰ ہے کہ جو شخص کہتا ہے کہ سُود لینا گناہ نہیں ہے وہ ملحد خارج از دین ہے اور فادر جون کا کہنا ہے کہ سُود خوروں نے اپنی دنیوی زندگی کا شرف کھو دیا ہے اور مرنے کے بعد وہ کفن پہنائے جانے کے بھی اہل نہیں ہیں۔

غرض تاریخِ امم میں کسی ایسی قوم کا سُراغ نہیں ملتا جس نے سُود کی مذمّت نہ کی ہو اگر کسی قوم نے کسی حیثیت سے سُود کی اجازت دی تو وہ لوگ بھی لاشعوری طور پر سُود لینے کو ایک قسم کا معاندانہ رویّہ تصوّر کرتے ہیں۔

منوّ کے دھرم شاستر اور مِلل سابقہ کی کتابوں میں سُود کی ممانعت کے ساتھ ساتھ جہاں اجازت دی گئی ہے وہ صرف ایسے اشخاص کے لیے ہے جن کا قرض دینے والے کے ساتھ اخوّت وہمدردی کا کوئی رشتہ تسلیم نہیں کیا گیا۔

مِلل سابقہ میں سُود کے جواز کی جو راہیں نکالی گئیں اُن کے لیے اخلاقی یا روحانی تعلیمات اور انبیاء کے اسانید یا دینی علماء کے اقوال سے کوئی تائید نہیں ملتی۔ یہاں تک کہ سُودی غلاظت میں لتھڑے ہوتے معاشرے جن کے معاشی اور اقتصادی نظام کا تمام ڈھانچہ سُود کی بنیادوں پر رکھا گیا ہے وہ بھی سُودی نظام کاری کی تباہ کاریوں سے خدا کی پناہ مانگ رہے ہیں، ان کے نزدیک ایک مستحکم اقتصاد کی بنیاد اس امر پر ہے کہ سُود کی فیصد مقدار نفی کے برابر ہو جائے۔ دوسرے لفظوں میں اس کے یہ معنی ہیں کہ ملکی اقتصادیات میں سُود کی مقدار جتنی زیادہ ہو گی اتنا ہی مملکت کا اقتصادی نظام ناپائیدار اور زوال پذیر ہو گا۔

اسلام کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد ہر قسم کا سُود یک قلم حرام قرار پایا۔ ہنود و یہود و نصاریٰ کے نزدیک جہاں کہیں سُود کی اجازت تھی وہ سب مطلقاً اور قطعاً حرام کر دی گئی اور یہ حُرمت اس قدر قطعی اور ہمہ رس تھی کہ سُود کے کسی شائبہ کو اس میں راہ پانے کی گنجائش نہ رہی۔ قرآنِ حکیم میں لفظ "حرّم الرّبا" حرمتِ سُود کے باب میں ایک قطعی الدلالۃ اور ہمہ جہتی تحریم پر دال ہے اور اس کی تشریح مزید اس طرح کی گئی کہ زرِ اصل سے زیادہ جو کچھ بھی لیا جائے وہ سُود ہے "وَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ" کا نہایت واضح مدعا یہی ہے اور ایک دوسری آیت میں سُود لینے کو ظلم سے تعبیر فرمایا کہ "لا تظلمون"، یعنی سُود لینا ظلم ہے۔ اور ان تمام مفادات کو جو اضافہ مال کی شکل میں سُودی کاروبار کے اندر متصوّر ہیں ان کی نفی فرمائی "فَلَا يَرْبُو عِندَ اللهِ" یعنی اس میں تم کتنی ہی منفعت تصوّر کرو اللہ کے نزدیک وہ نقصان ہی نقصان ہے کیونکہ "یَمْحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰو" اللہ تعالیٰ ہر اس منفعت کو جو سُود میں تصوّر کی جاتی ہے مٹا دیتا ہے۔ اہلِ علم کی رائے ہے کہ سُود کا نقصان آخرت میں تو جو ہونا ہے وہ ہے ہی دنیا میں بھی سُودی فوائد عارضی و وقتی ہوتے ہیں اور احادیث میں آیا ہے کہ انجام کار سُودی معاملات خسارے پر منتج ہوتے ہیں۔

زمانہ کی ستم ظریفی دیکھیے کہ وہ تمام قومیں، جن میں خدا اور آخرت کا تصوّر ایمان اور اعتقاد کی شکل میں موجود ہے اور جن کے نزدیک سُودی نظام کار شرعی ممنوعات میں سے ہے وہ بھی اس میں آلودہ ہیں۔ یہاں تک کہ کچھ لوگ سُود جیسی متفقہ لعنت کو کسی نہ کسی طرح ملّتِ اسلامیہ کے بنیادی مراجع قرآن و سُنّت میں داخل کرنے کی

سعیٔ نامشکور میں مصروف ہیں۔ راقم الحروف کے نزدیک اس کا سبب یہ ہے کہ ان اصحاب نے قرض کی تعریف اور اس کے اغراض کی بنیادی حیثیت کو نظر انداز کر دیا ہے۔

بدءِ کائنات انسانیت سے آج تک دنیا میں جتنی قومیں، جتنے مذاہب بلکہ جس قدر تمدنی اور عمرانی تنظیمات معرضِ وجود میں آئی ہیں اُن سب کے نزدیک انقراض یا قرض دینے کی ایک ہی غرض و غایت ہے اور وہ یہ ہے کہ قرض صرف ابنائے نوع کی حاجت روائی اور نفع رسانی کی غرض سے دیا جاتا ہے۔ شریعتِ اسلامیہ نے قرض دینے کو بھی صدقہ کی ایک اچھی قسم سے تعبیر فرمایا ہے۔

اب ظاہر ہے کہ حاجت روائی اور نفع رسانی کے اقدامات میں حاجت براری اور منفعت کوشی کا مقصد نہ صرف یہ کہ انسانی فطرت کی انتہائی پستی ہے بلکہ قرض کو اس کے قدرتی مفہوم سے خارج کر دیتا ہے۔ اب اس کو قرض نہیں بلکہ دولت کی تجارت سے تعبیر کرنا زیادہ موزوں ہے جس کو ماہرینِ اقتصادیات ایک ناقابلِ عفو جرم تصوّر کرتے ہیں۔ وہ چیز جو قیمت کے طور پر استعمال کرنے کے لیے بنائی گئی ہے اگر اس کو جنسِ تجارت کی طرح استعمال کیا جائے تو اس سے معاشی و معاشرتی مفاسد کا ایک دروازہ کھُل جاتا ہے۔ زراندوزی اور دولت کے ارتکاز کا سب سے بڑا ذریعہ یہی ہے کہ زرِ نقد کو مالِ تجارت کے طور پر استعمال کیا جائے۔ مصری فاضلِ اقتصادیات ڈاکٹر لبیب شقیر نے اپنی کتاب "تاریخ الفکر الاقتصادی" میں ارسطو کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اگر نقدی کو قرض کے طور پر دے کر اس سے منفعت حاصل کی جائے تو اس کا نام سُود ہے اور یہ عمل نقود کو اس کی ماہیت سے دُور کر دیتا ہے کیونکہ نقود کی اصلیّت محض تبادلِ اشیاء کے درمیان ایک واسطہ کی ہے (یعنی اشیاء تبادل کی قدر و قیمت میں مساوات کے تعین کا ایک ذریعہ ہے) اب اگر نقدی پر نفع حاصل کیا جائے تو یہ محض غیر منصفانہ عمل ہوگا۔ کیونکہ اس صورت میں منفعت کسی شے کے عوض نہ ہوگی اور نقدی اس لیے نہیں ہے کہ اس سے مزید نقدی پیدا کی جائے (بلکہ دراصل وہ ایک ایسی شے ہے جو بذاتِ خود نفع یا اضافہ کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ ارسطو کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً ایک روپیہ ہمیشہ ایک روپیہ رہے گا۔ اس سے سوا روپیہ کی چیز تو خریدی جا سکتی ہے روپیہ کا سوا روپیہ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر یہ نہیں ہو سکتا تو پھر کیسے ممکن ہے کہ ایک روپیہ دے کر سوا روپیہ وصول کیا جائے یہ تو بہرحال ظلم ہوگا۔ لفظ ربا کی تصریح میں علامہ سرنج کا نظریہ بھی ارسطو سے مطابقت رکھتا ہے۔ وہ بھی ربا کے معنی کی اصل یہ بتاتے ہیں "وضع للزیادۃ فی نفس الشیٔ" یعنی ربا یہ ہے کہ کوئی شے بذاتِ خود بڑھ جائے لیکن دوسری شے کے مقابلہ میں زیادہ ہونے کے

معنوں میں یہ لفظ مجاز ہے[1]۔

اسی طرح کسی بھی شے کو جسے ثمن یا قیمت قرار دیا جائے اس میں بڑھوتری بنیادی طور پر درست نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مثلاً اگر ایک من گندم کو زرِ ثمن قرار دے کر کوئی شے اس کے عوض خریدی جائے تو اس طرح خریدی جا سکتی ہے کہ خود زرِ ثمن میں کوئی اضافہ نہ ہو، یعنی سوا بوری گندم ایک بوری گندم کے عوض خریدنا بنیادی طور پر معاشی نظریات کے منافی اور تباہ کن ہے، البتہ ایک بوری گندم کے عوض سوا بوری جو یا چنا خریدا جا سکتا ہے، کیونکہ اس طرح زرِ ثمن میں اضافہ نہیں ہوتا۔ ایک بوری گندم ایک بوری ہی رہے گی۔

شریعتِ اسلامیہ میں ربا الفضل کے حرام ہونے کی یہی بنیاد ہے لیکن جیسا کہ ہم نے ابتداء میں کہا اس مقالہ میں اس کی تفصیلی کا موقع نہیں یہاں پر سودی قرض کا ذکر ہی مناسب ہے۔ ہم یہ بتا چکے ہیں کہ قرض پر سود لینا دراصل قرض کی اصلیت کو نظر انداز کر دینا ہے اور وہی نیکی جو مذہب اسلام کے نزدیک صدقہ کی بہتر قسم ہے اور جس کے اجر اور بڑھوتری کا ذکر قرآن حکیم نے فرمایا ہے محض سود کا عنصر شامل ہونے کے باعث ایک بدترین قسم کی معصیت بن جاتی ہے اور چونکہ ہمیشہ سودی معاملات میں قرض دینے والے کو مقروض کے حالات سے کوئی غرض نہیں رہتی اس لیے قرض دینے کا قابلِ قدر ایثار خود غرضی، منفعت کوشی اور زر اندوزی کی قابلِ نفرت برائیوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

قرض کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ قرض کا معاملہ لازمی طور پر ایسی اشیاء میں ہوتا ہے جس کی جنس رائج اور جس کا بدل ممکن الحصول ہو مثلاً روپیہ یا اناج وغیرہ۔ چنانچہ شریعتِ اسلامیہ کی رُو سے سواری، سامانِ خانہ یا لباس کو عاریت کے طور پر تو دیا جا سکتا ہے لیکن قرض کے طور پر منتقل نہیں کیا جا سکتا لہٰذا ایسی اشیاء کا قرض میں دینا جائز نہیں ہے جس کا ہم جنس بدل دستیاب نہ ہو۔ عاریت اور قرض میں فرق یہ ہے کہ عاریت میں دی ہوئی شے کا بعینہٖ واپس کرنا ضروری ہے لیکن قرض میں قرض لی ہوئی شے کا بدل (ہم جنس) ادا کرنا فرض ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ قرض کا معاملہ لین دین کا وہ طریقہ ہے جو ہم جنس اشیاء کے سوا اور کسی طرح ممکن نہیں ہے کوئی شخص اگر ایک بوری گندم قرض لے کر اس کی ادائیگی نقدی یا کسی اور متبادل شے کے ذریعہ کرنا چاہے تو اس کو تجارت کہتے ہیں۔ یہ قرض نہیں ہے لہٰذا اس میں نہ ایثار ہے نہ صدقہ ہے نہ نیکی کا کام ہے اور نہ اس کا کوئی ثواب ہے۔ بلکہ یہ ایک معاشی معاملہ ہے اور سود کے تصور سے خالی ہے، کیونکہ

---

[1] منقول از ربا المحرم ص ۲۸۔

سُودی معاملہ صرف وہی ہے جس میں کوئی شے تھوڑی دے کر زیادہ لینے کی شرط پر کیا جاتے اور جو کچھ دیا ہے اس سے زیادہ لینے کی شرط صرف اسی صورت میں متصوّر ہو سکتی ہے جبکہ معاملہ ہم جنس اشیاء کا ہو جو قرض دینے کی لازمی شرط ہے۔ مثلاً دو بوری گندم یا سو روپیہ قرض اس شرط پر دیا جاتے کہ قرض لینے والا ایک مقررہ مدت کے بعد ڈھائی بوری گندم یا ایک سو دس روپے واپس کرے گا ظاہر ہے کہ نہ یہ عدل کا تقاضا ہے نہ حسن معاشرہ کے مزاج کے مطابق ہے اور نہ یہ قرض کی تعریف میں آتا ہے بلکہ یہ ہم جنس اشیا کی تجارت بالتفاضل ہے جس کو اصطلاحِ شرع میں ربائے فضل کہتے ہیں اور جس کو حرام قرار دیا گیا ہے یہ مضمون اس کی تفصیل کا متحمل نہیں ہے جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا۔

قرض کی ایک تیسری خصوصیت یہ ہے کہ قرض دینے والے کا مال مقروض کے قبضہ میں جانے کے باوجود وہ مال حقیقتاً یا حکماً قرض دینے والے کی ملکیت میں متصوّر ہوتا ہے اور گو وہ مال مقروض کے کام میں آتا ہے تاہم مذہب اسلام کی رُو سے وہ مال اصل مالک (قارض) کے لیے فاضل اور زاید از ضرورت تسلیم کیا گیا ہے اسی بنا پر قرض میں دیتے ہوئے مال کی زکوٰۃ قارض پر واجب ہوتی ہے۔ مال قرض کی مالکانہ حیثیت کا دوام قارض کو شرعاً یہ حق دیتا ہے کہ وہ میعاد ادائیگی قرض کے اندر بھی واپسی قرض کا مطالبہ کرے، قانون شرع اس کی اجازت دیتا ہے۔ تاہم میعاد کا انتظار کرنا ایک مستحسن فعل اور میعاد سے زیادہ عرصہ کے لیے مہلت دینا بہت بڑے اجر کا موجب قرار دیا گیا ہے۔

قرض دینا اور قرض دیتے ہوئے مال کی زکوٰۃ خود ادا کرتے رہنا اسلامی حُسنِ معاشرہ اور ایثار کا وہ بلند معیار ہے جس کی نظیر کسی اور قوم یا کسی دوسرے نظام معاشرہ میں نہیں مل سکتی لیکن سُود کا تصور درمیان میں آتے ہی اسلامی مدنیت کی یہ سر بفلک عمارت دھڑام سے زمین پر آ پڑتی ہے اور دنیا پرست جیفہ خوار اقوام کے معاشرتی نظام کی طرح مزبلہ کا ایک ڈھیر بن کر رہ جاتی ہے۔ مملکتِ پاکستان کے بعض دانشمند اصحاب رائے نے بھی ربوی نظام کے غیر شریفانہ مزاج اور اس کی تباہ کاریوں کو خوب محسوس کیا ہے اور ان کی رائے میں اس ملک سے سُود کی لعنت کو دُور کرنے کا ہر اقدام مستوجب تحسین ہے تاہم شاید موجودہ ابتلائے عام کے آگے ہتھیار ڈال کر اب وہ یہ خیال کرنے لگے ہیں کہ صرف وہی سُود قابلِ ابطال ہے جو احتیاجی قرضوں پر لیا جاتے۔ ایسے قرضے بھی ہیں جو نفع آور اغراض کے لیے کسی بنک، کاروباری ادارے یا کسی تاجر کو منفعت بخش کاروبار میں لگانے کے لیے دیتے جاتے ہیں۔ اس منفعت کے پیشِ نظر

جو قرض لینے والا اس رقم قرض سے حاصل کر سکتا ہے اگر قرض دی ہوئی رقم پر سُود لیا جائے تو شرعاً روا ہونا چاہیے ۔ یہ دلیل اس ناگزیر صورتِ حال کے پیشِ نظر ہے جس سے اقوامِ عالم اور بین الملکتی روابط دو چار ہیں نہایت جاذب نظر معلوم ہوتی ہے اور چونکہ عہدِ حاضر میں سُودی نظام معیشت کی غلاظت سے بیشتر اشخاص کا دامن ملطخ ہے اور اس سے مفر متصور نہیں اس لیے یہ اصحاب نیک نیتی سے یہ چاہتے ہیں کہ اس قسم کے قرضوں کے سُود کو اس شدید حُرمت کی زد سے بچا لیا جائے جو قرآن اور احادیث میں ربوٰ کے متعلق وارد ہے، چونکہ سُود کے مطلق حرام ہونے کے خلاف آواز اُٹھانا ملّتِ اسلامیہ کی سیزدہ صد سالہ روایات کے قطعاً منافی ہے اور سُودی نظام کو کسی نہ کسی حد تک بھی اسلام کے نظامِ مملکت میں داخل کرنا مشکل ہے ۔ اس لیے یہ اصحاب قرآن و احادیث کے اشارات اور حالاتِ حاضرہ و تقاضائے وقت کا سہارا تلاش کرنے میں مصروف ہیں جس کی بنا پر جواز کی کوئی صورت تلاش کی جا سکے۔

ہم کو ایسے اصحاب کی نیت ان کی اسلام پسندی اور ملّت دوستی پر کوئی شبہ نہیں تاہم جوازِ ربوٰ کی اس سرگرم جستجو سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے ظاہری مذہبی احکامات کی موجودہ صورت میں بظاہر اس کے جواز کا سراغ نہیں ملتا لہٰذا اس جستجو میں فکر و نظر کی ٹھوکروں سے بچنے کے لیے ان راستوں کا اچھی طرح دیکھنا ضروری ہے جن سے جوازِ ربا کی منزل تلاش کی جا سکتی ہے ۔

یہ عجیب بات ہے کہ شریعتِ اسلامیہ نے قرض کی نیکی کو جس جذبۂ ایثار کی بدولت انسانیت کے محاسن میں شمار فرمایا قرض کے جواز کی دلیل اسی جذبہ کی موت میں تلاش کی جا رہی ہے ۔ قرض کا نیکی ہونا اس امر پر موقوف ہے کہ قارض کو اس سے کسی جلبِ منفعت کی توقع نہ ہو ۔ حدیث میں آیا ہے کہ ایسا ہو تو اسے ربا (یعنی سُود) قرار دیا جائے گا "کل قرض جر بہ منفعۃ فھو ربا" ہر وہ قرض جس سے کچھ فائدہ حاصل کیا جائے وہ سُود ہے ۔

اکابر اسلام نے ارشاداتِ نبوی کی روشنی میں ہی مقروض سے تحفہ لینا اس کی سواری پر سوار ہونا یا اس کے گھر دعوت کھانا یا اس سے امتیازی سلوک کی توقع رکھنا ممنوع قرار دیا ہے کیونکہ ان تمام امور میں شائبہ ربا ہے غرض قرض کی بنیاد خالص ایثار پر ہے لیکن جواز قرض کی راہوں کے متلاشی اصحاب قرض دینے کے فوائد ہی کو اصل قرار دے کر ربوی نظام کی اہمیت کے قائل اور مبلغ ہیں ۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی ۔

دانشِ حاضر کو اب تک یہ جرأت تو نہیں ہوئی کہ وہ مطلقاً ربا کو حلال قرار دے سکتے ۔ البتہ اس کی

حرمت کو محدود کرنے کے سلسلہ میں مختلف اصحاب نے جو کوششیں کی ہیں وہ بقول علامہ مصری ڈکٹور ابراہیم زکی الدین بدوی مقصد کے اعتبار سے ایک ہیں لیکن ان کے رسائل و دلائل مختلف ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "ربا کے موضوع پر جو علمی مباحث چل رہے ہیں ان سب سے ان حیلوں کا سراغ چلتا ہے جن سے نفع آور قرضوں اور دوسرے نفع آور معاملات کو شریعت کے حرام کردہ ربا کے دائرہ سے خارج کرنا مقصود ہے۔"

ایسے حیلوں میں انہوں نے سب سے پہلے قرآن حکیم کی آیت سورۂ آل عمران سے استدلال کرنے کا ذکر کیا ہے کہ قرآن حکیم میں "لا تاکلوا الربا اضعافا مضاعفة" کے الفاظ ہیں جن کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ جب تک سود اصل زر کا دُگنا تگنا نہ ہو جائے روا ہے۔ دوسرا حیلہ یہ ہے کہ جو قرض نفع آور اغراض کے لیے دیا جائے وہ قرآن کی رو سے حرام نہیں ہے تیسرا حیلہ یہ ہے کہ نفع اور قرض بھی اگر تباہ کرنے کے لیے دیا جائے، جیسا کہ سابقاً ہوتا رہا ہے تو حرام ہے اور اگر صرف نفع آوری یا تجارت کے لیے دیا جائے تو سود حلال ہے۔ چوتھا حیلہ یہ ہے کہ شریعتِ اسلامیہ نے جس طرح مضاربت میں نفع حاصل کرنے یا قرض فروخت کی صورت میں موجود الوقت دام سے زیادہ دام وصول کرنے کو جائز قرار دیا ہے اور اس نفع کی بنیاد بھی مدت کی بنیاد پر رکھی گئی ہے۔ اسی طرح قرض پر بھی سود لینا جائز ہونا چاہیے۔

علامہ موصوف نے بتایا ہے کہ مصر اور دوسرے متعدد بلادِ عربیہ میں جو شہری قوانین نافذ ہیں وہ اسی اصول (نفع آور قرض) کی بنیاد پر بنائے گئے ہیں۔

خود علامہ بدوی موصوف عصرِ حاضر کے ان متقشّنین سے اس قدر متاثر تھے کہ انہوں نے اپنے رسالہ "القانون والاقتصاد" میں نفع آور قرضوں پر سود کے جائز ہونے کے متعلق بہت کچھ لکھا لیکن ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے طویل تحقیق کے بعد ان نظریات کی خامی اور غلطی کو واضح کر دیا۔ ان حیلوں کے علاوہ ایک اور حیلہ بھی ہے جس کا ذکر علامہ موصوف نے آگے چل کر کیا ہے اور وہ حیلہ یہ ہے کہ قرآنِ حکیم نے صرف اس سود کو حرام کیا ہے جو عہدِ جاہلیت میں رائج تھا اور جو موجودہ زمانہ سے مختلف ہے لہٰذا عہدِ حاضر کے ربا کا اس ربائے محرم پر اطلاق نہیں ہوتا۔

بعض اصحاب نے صرف اسی صورت میں سود کو حرام قرار دیا ہے جبکہ قرض اور اس کا سود اسی طرح کا ہو جیسا کہ جاہلیت میں تھا۔ چنانچہ جو لوگ نفع آور قرضوں کو ربائے جاہلی میں داخل نہیں سمجھتے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ عہدِ جاہلی میں ادائے قرض کی میعاد گزر جانے پر قارض کہتا تھا کہ یا تو زرِ قرض ادا کیا جائے یا پھر اس پر اضافہ کرنا منظور کر لیا جائے۔ ایسے اصحاب کہتے ہیں کہ بس یہی سود ممنوع ہے کیونکہ موجودہ نفع آور قرض میں تو سود کی شرط

انقضائے میعاد ادائیگی پر نہیں لگائی جاتی بلکہ قرض دینے کے وقت ہی سُود کی رقم متعین کر دی جاتی ہے لہٰذا اس تفاوت کی وجہ سے یہ صورت حلال ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ استدلال انتہائی کمزور ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ سُود کا جو مطلب ہے وہ وہی ہے جو تاریخ کے قدیم ترین زمانہ سے سمجھا جاتا ہے کہ سُود اصل شئے پر زیادتی ہے جس کی شرط ابتدائے عقد سے مقرر کر لی جاتی ہے اور انقضائے میعاد ادائے قرض پر جو قارض کہتا ہے کہ اب اصل زر دیتے ہو یا سُود دینا چاہتے ہو اس میں بھی یہی صورت ہے کہ مثلاً سال بھر کے لیے قرض بلا سُودی تھا اور اس کے بعد سُود تھا اور یہ امر پہلے سے فریقین کو معلوم تھا لہٰذا یہ زیادتی قرض دیتے وقت ہی مشروط تھی اگر بالفرض فریقین کے اذہان سُود کے تصور سے اس وقت خالی رہے ہوں تو وہ قرض عین ثواب تھا اس میں حرمت اس وقت آئے گی جب آئندہ سال کے لیے سُود کا مطالبہ کیا جائے گا۔ غرض اس سے حلتِ سُود کا استدلال قطعاً نادرست ہے۔ علامہ بدوی کہتے ہیں:

"وکنت مع الاسف من القائلین بذالك فی مقالی القدیم بمجلة القانون والاقتصاد" ص ۳۲

یعنی مجھے اپنے حال پر افسوس ہے کہ میں بھی اس غلط استدلال کا قائل تھا جیسا کہ میں نے اپنے مقالات شائع شدہ القانون والاقتصاد میں لکھا ہے۔

عہدِ رسالت کے قرضوں اور اس کے سُود سے موجودہ عہد کے نفع آور قرضوں اور اس کے سُود کو مستثنیٰ کرنے کی ایک دوسری توجیہ جدید اس طرح کی گئی ہے کہ عہد نبوی کے تمام قرضے احتیاجی قرضے تھے اور اس وقت لوگ نفع آور اغراض کے لیے قرض کے لین دین سے ناواقف تھے۔

قرآن میں جس سُود کی ممانعت ہے وہ صرف احتیاجی قرضوں تک محدود ہونا چاہیے اور نفع آور اغراض کے قرضوں پر سُود لینا جائز ہے۔

یہاں پر پھر قرض کی ماہیت اور اس کے اغراض کے صحیح تصوّر کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرض دینے کی غرض صرف ایک ہے اور قرض لینے کی اغراض کا کچھ شمار نہیں ہے۔ قرض کا مفہوم صرف مقروض کی حاجت روائی یا نفع رسانی ہے، رہا یہ کہ قرض لینے والے نے کس مقصد کے لیے قرض لیا یا قرض کی لی ہوئی رقم کو وہ کس طرح کام میں لانا چاہتا ہے یہ فیصلہ صرف قرض لینے والے کی صوابدید پر موقوف ہے۔ قرض دینے والا اگر کسی خاص مقصد کا تعیّن کر کے قرض دے بھی تو از روئے شرع وہ سب باطل ہے اور قانون شرع کی رُو سے غیر مؤثر ہے۔ چنانچہ مثلاً اگر کوئی شخص تجارت کے لیے قرض لیتا ہے تو شرعاً اس پر کوئی پابندی

نہیں ہے کہ وہ اس کو تجارت ہی میں لگاتے ۔ جائز ہے کہ وہ مقروض اس روپیہ کو اپنی اولاد کی شادی پر خرچ کر دے ۔ قرض دینے والا صرف واپسی رقم کا مطالبہ کر سکتا ہے ۔ مقروض کے اپنے متعین کردہ مصارف پر شرعاً نہ قانوناً اُسے باز پُرس کا حق نہیں ہے اور نہ اس کے خلاف کوئی کارروائی کی جا سکتی ہے لہٰذا تجارتی، زرعی، صنعتی یا احتیاجی قرضوں کی جو اصطلاحیں آج کل زبان زدِ عام ہیں، شریعتِ اسلامیہ میں ان کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے ۔ مثلاً اب بھی تجارت کے لیے قرضہ لینے والا اگر قرض کی رقم کو زراعت پر لگا دے تو شرعاً اس پر کوئی تاوان عائد نہیں کیا جاتا ۔ اسی طرح موجودہ بنکاری کے نظام میں بھی تجارتی بنکوں میں جو روپیہ اس نیت سے جمع کرایا جاتا ہے کہ وہ تجارت پر لگایا جائے گا کیا فی الواقع وہ محض تجارت میں لگایا جاتا ہے اور اس روپیہ کو بنک گراں قدر سُود پر تاجروں کو قرض نہیں دیتا ؟ اور پھر اس بڑے سُود سے جو بنک تجار سے حاصل کرتا ہے ایک مختصر سا حصہ رقم جمع کرانے والے کو ادا نہیں کیا جاتا ؟ اگر فی الواقع تجارتی اغراض سے دیئے ہوئے روپیہ کو دوسرے مصارف مثلاً اہلِ زراعت وصنعت یا حاجت مندوں کو زیادہ شرح سُود پر دینا کوئی قانونی جُرم ہے تو یہ کیوں نہ تسلیم کیا جائے کہ تمام بنکاری ادارے وعدہ خلافی، دھوکہ دہی اور بے ایمانی کی بنیاد پر چل رہے ہیں ۔ لہٰذا یہ سوال اب سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تجارتی قرض یا نفع آور قرضے تھے یا نہیں تھے اور یا یہ کہ احتیاجی قرضوں کی کون کون سی قسمیں رائج تھیں جن پر سُود کو حرام قرار دیا جائے کیونکہ قرض کی اغراض سے اس کی اقسام کا تصور اور اس کے اقسام کی بنا پر سُود کی حِلّت وحُرمت کا انحصار بے معنی ہے ۔ قطع نظر اس کے کہ عہدِ نبویؐ کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اس وقت تجارت وصنعت وحرفت اور دوسری احتیاجات زندگی سب بالکل اسی طرح موجود تھیں جس طرح عہدِ حاضر میں ہیں ۔ ان کے معیار، وسعت اور کمیت وکیفیت میں تو فرق ہو سکتا ہے لیکن یہ کہ قرض کے اغراض کی بنا پر ان کی ہیئت بدل جاتی ہو ایسی کوئی نظیر نہیں ملتی ۔ حتیٰ کہ اگر کوئی شخص قرض لی ہوئی رقم کو ارتکابِ معصیت یا مُسرفانہ تقریباتِ عیش ونشاط میں صرف کرے یا اس کے برعکس قرض لے کر کوئی شخص فریضۂ حج ادا کرے یا کسی مسجد کی تعمیر پر صرف کرے تو معاملہ قرض کی قانونی حیثیت سے ان دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں آیا، قارض صرف اپنی رقم کا مطالبہ کر سکتا ہے ۔ کسی صورت میں ناروا اخراجات کی پاداش میں اس پر کوئی جُرمانہ عاید کرنے کا مجاز نہیں ہے کیونکہ یہ تمام امُور قرض کی ماہیت اور مزاج سے خارج ہیں ۔ اگر کوئی شخص قرض لے کر مسجد کی تعمیر کرنے کے بجائے وہ روپیہ تجارت میں لگا کر خاطر خواہ منفعت اندوز ہو تو

۲ اگرچہ اس کی یہ منفعت تعمیرِ مسجد کی منفعت کے مقابلہ میں کچھ حقیقت نہیں رکھتی، تاہم اس جرم کی پاداش میں کہ اس نے قرض کے روپیہ سے مزید دولت کیوں حاصل کی، سود کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔

صرف نفع آور قرضوں کے سود کو حلت کے دائرہ میں لانا ایک مضحکہ خیز امر بن جاتا ہے۔ اگر بدکاری و مے نوشی کے قرض پر صرف اس لیے سود کو حرام کر دیا جائے کہ وہ قرض نفع آور کاموں میں نہیں لگایا گیا تو یہ تحدید عجیب بھی ہے اور خلافِ عقل و مصلحت بھی۔ عقل اور مصلحت کا تقاضا تو یہ تھا کہ جو لوگ بیجا مصارف کے لیے قرض لیتے ہیں ان کو اپنے کیفرِ کردار پر پہنچنے کے لیے زیادہ سے زیادہ سود ادا کرنے پر مجبور کیا جائے اور جو لوگ تجارت یا صنعت و حرفت وغیرہ نفع آور اغراض کے لیے قرض لیتے ہیں ان پر سود کو اسی طرح حرام قرار دیا جائے جس طرح حاجتمندوں اور فلاکت زدہ انسانوں کی مشکلات کو کم کرنے والے قرضوں پر سود لینا حرام خیال کیا گیا ہے۔ جوازِ قرض کی ایک اور توجیہ اس نقطۂ نظر میں مخفی ہے کہ بنکاری یا تاجرانہ قرضوں سے بنی نوع انسان کو انفرادی اور اجتماعی فوائد حاصل ہوتے ہیں اور اس سے مقروض پر کوئی بار نہیں پڑتا بلکہ وہ بخوشئ خاطر غنیمت لیتا ہے اس سے زیادہ کے مطالبہ کو تسلیم کرنے پر تیار ہو جاتا ہے لہٰذا اس قرض پر معاشی بہبود کے پیشِ نظر سود لینا روا ہے لیکن جوازِ سود کی یہ توجیہ بھی قرض کی ماہیت کو نظرانداز کرنے کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ قرض دینے والا جب قرض دیتا ہے تو مقروض کی محنت و مشقت و نفع کوشی کا ثمرہ نہ اس کے پیشِ نظر ہوتا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اگر یہ امر پیشِ نظر ہو تو قرض کے وقت زرِ اصل پر فی صد منافع کی قید نہ لگاتا۔ اس فیصد منافع کا مقروض کی منفعت کے مقابلہ میں یا تو نہایت ہی کم ہونا یا نہایت ہی زیادہ ہونا ممکن ہے اور اعتدال کا تصور شاذ و نادر رہے۔ تاجر اگر ہزار روپیہ سے سال بھر میں دو ہزار کماتا ہے تو اس کے لیے کہاں تک جائز ہے کہ وہ مالکِ متاع کو جس کے روپے سے یہ روپیہ اس نے کمایا صرف بارہ روپے سال بھر کے بعد پیش کرے یا پھر یہ صورت کہ ہزار روپیہ لگایا ہوا بھی ڈوب جائے اور باوجود اس کے وہ سال بھر کے بعد رقم سود واجب قارض کو ادا کرنے پر مجبور کیا جائے۔

انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ روپیہ دینے والا طالبِ قرض سے یہ کہتا کہ روپیہ میرا ہے اور محنت تمہاری اس سے جو منافع ہو اس میں سے مثلاً پچیس ۲۵ فیصد مجھے دینا اگر منافع نہ ہو تو تمہاری محنت ضائع اور میرا مال ضائع۔ اس قسم کے معاملہ کو اسلام کی اصطلاح میں مضاربت کہتے ہیں اور دولت سے جائز منفعت کمانے کی یہی صورت ہے لیکن یہ قرض نہیں ہے۔

قرض اور سود دو متضاد تصورات ہیں جن کا اسلام سختی سے مخالف ہے۔